شبیر احمد

چھٹی صدی مسیحی کے دو اہم واقعات

چھٹی صدی مسیحی تاریخ میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ یہ بجا طور پر قدیم اور جدید کے درمیان حدِ فاصل قرار دی جا سکتی ہے۔ اس صدی کے اہم واقعے دو ہیں:

(الف) ایتھنز کے مدرسۂ فلسفہ کی قفل بندی (۵۲۹ء)، اور

(ب) کوہِ فاران سے آفتابِ ہدایت کا طلوع (۵۷۰ء)[1]

یعنی انسانیت عقل پر غیر مشروط اعتماد سے (جو یونانی فلسفہ و حکمت کا منتہائے نظر تھا) مایوس ہو چکی تھی اس لیے اس نے عقل پرستی کے آخری گہوارے میں قفل ڈال دیا۔ گویا کوئی منادی ندا دے رہا تھا:

تا بخوانی حکمتِ یونانیاں — حکمتِ ایمانیاں را ہم بخواں

حکمتِ یونانیاں چوبیں بود — پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اس کے بعد فطرتاً اسے اس "حکمتِ ایمانیاں" کی تلاش و جستجو ہونا چاہیے تھی۔ دریائے رحمت جوش میں آیا اور ہدایتِ ربانی کا آخری نزول حسبِ تقدیرِ خداوندی "وادی غیر ذی زرع" میں ہوا۔

(الف) ایتھنز کے مدرسۂ فلسفہ کی قفل بندی

۵۲۹ء میں قیصر جسٹینیان (Justinian) نے ایتھنز کے مدرسۂ فلسفہ کو بند کر دیا

---

(۱) چنانچہ توریت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی سفر مثنیٰ باب ۳۳ درس ۲ میں بدیں الفاظ کی گئی ہے:

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور آخری فلسفی ملک بدر کر دیے گئے۔ چنانچہ ویبر "تاریخ فلسفہ" میں لکھتا ہے:

" ۵۲۹ء میں شرک پسند نو افلاطونیت کی آخری جائے پناہ یعنی ایتھنز کا مدرسۂ فلسفہ جہاں برہ فلس نے تعلیم دی تھی شہنشاہ جسٹینیان کے حکم سے بند کر دیا گیا۔ عہد ماضی کے اس منہدم آثار سے عوام اس درجہ بے پرواہ تھے کہ شاید ہی کسی نے اس اعلان شاہی کا نوٹس لیا ہو۔"[1]

بظاہر اس کی وجہ مسیحی تعصب و تنگ نظری سمجھی جاتی ہے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ یونانی عبقریت بوڑھی ہو چکی تھی اور اس میں بدلے ہوئے زمانہ کی ثقافتی قیادت کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔ ذیل میں اس بات کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

اس توضیح کے تین حصے ہیں:

۱۔ یونانی ثقافت کی قدامت

۲۔ مسیحی تعصب و ثقافت بیزاری، اور

۳۔ علم و حکمت کے دور قدیم (یونانی دور) کا خاتمہ۔

۱۔ یونانی ثقافت کی قدامت و عظمت

یونانی ثقافت یونانی فضلا کی ہزار سالہ تفکیری مساعی کا نام ہے۔ اس کی ابتدا تالیس الملطی (Thales of Miletus) سے ہوتی ہے جس کا زمانہ ۶۲۴ لغایت ۵۴۸ ق م ہے اور انتہا ۵۲۹ء میں جب کہ ایتھنز کا مدرسۂ فلسفہ بند کر دیا گیا۔ اس طویل مدت میں یونانی عبقریت نے متعدد حکماء و فلاسفہ پیدا کیے جنھوں نے منطق و فلسفہ، ریاضی و ہیئت اور طب کے علوم کو سائنٹفک بنیادوں پر مدوّن کیا۔

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

"The Lord came from Sinai, and rose up from Seir unto them; he shined forth from Mount Paran" (Deut. 32 : 2).

[1] Weber, *History of Philosophy*, p. 142.

اس ہزار سالہ مدت کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے: قبل سقراطی دور، یونانی فلسفہ کا عہد زریں، (سقراط، افلاطون اور ارسطو کا زمانہ) بعد ارسطاطالیسی دور (ابیقوریت) رواقیت اور ارتیابیت نیز انتخابیت)، اور یونانی فلسفہ کا عہد آخر (یونانی یہودی فلسفہ، نوفیثاغورثیت اور نوفلاطونیت) لیکن یونانی ثقافت کا واسطۃ العقد اور "حکمتِ ایمانیاں" کا ممثل اعظم ارسطو تھا، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے "طبقات الامم" میں لکھا ہے:

والی ارسطاطالیس انتہت فلسفۃ الیونانیین وہو خاتمۃ حکمائہم وسید علمائہم"۔[1]

اور ارسطو پر یونانیوں کا فلسفہ ختم ہوگیا اور وہ ان کے حکماء کا خاتم اور ان کے علماء کا سردار ہے۔

ارسطو ۳۸۴ ق۔م میں شہر اسطاغیرا کے اندر پیدا ہوا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ایتھنز آکر افلاطون کے حلقۂ درس میں شریک ہوا اور استاد کی وفات تک وہیں رہا۔ ۳۳۵ ق۔م میں اس نے مقام لوقیون میں اپنا مدرسہ کھولا جو بعد میں "مشائیہ" کہلانے لگا۔ ۳۲۲ ق۔م میں اس نے وفات پائی۔ اس سے ایک سال قبل سکندر بھی انتقال کر چکا تھا۔

سکندر کے انتقال پر اس کی وسیع سلطنت اس کے جرنیلوں میں تقسیم ہوگئی۔ مصر بطلیموسی خاندان کے حصہ میں آیا جس نے تقریباً تین سو سال حکومت کی۔ بطالمہ اپنے ہمراہ یونانی علم و حکمت بھی لائے تھے۔ اُن کے عہد حکومت میں اسکندریہ یونانی ثقافت اور یونانی علوم کا گہوارہ اور دنیائے علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ ان کی علم دوستی اور علماء نوازی کے تذکروں سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ انھیں نے اسکندریہ کی مشہور لائبریری قائم کی۔ انھیں کے زمانہ میں ریاضی و ہیئت کے مشاہیر فضلاء اقلیدس و بطلیموس اور ارشمیدس و ابلونیوس زیوفنطس اور ایرن وغیرہ پیدا ہوئے جن کا ریاضی و ہیئت کی تاریخ میں خاص مقام ہے۔ بطلیموسی خاندان کی آخری تاجدار کلیوپیٹرا تھی جس کے زمانہ میں قیصر اوغسطس نے حملہ

---

(۱) طبقات الامم ص ۳۶

گیا اور مصر کو فتح کر کے رومن سلطنت کا ایک صوبہ بنا لیا۔ یہ ۳۰ ق۔م کا واقعہ ہے۔

کچھ ہی دن بعد مسیحیت کا ظہور ہوا، اور نیرو (۵۴ء۔۶۸ء) کے عہد حکومت میں نصرانیت مصر کے اندر داخل ہوئی اور جلد ہی عوام میں مقبول ہونے لگی۔ لیکن اپنی روزافزوں مقبولیت کی وجہ سے سلطنت کے لیے خطرہ سمجھی جانے لگی۔ بنابریں عیسائیوں پر جور و تعدی کا آغاز ہوا۔ اُن کی مذہبی آزادی چھین لی گئی اور وہ ترکِ مذہب کے لیے مجبور کیے گئے۔

اس جور و تعدی کے دوران میں فلاسفہ نے بھی مسیحی مذہب کو ہر طرح ہدفِ مطاعن بنایا اور پہلے رواقیوں (Stoics) نے اور بعد میں نوفلاطونی فلاسفہ نے عیسائی مذہب پر شدید اعتراضات کیے۔

۲۔ مسیحی تعصب و ثقافت بیزاری

آخر کار ۳۲۳ء میں قسطنطین اعظم تخت نشین ہوا اور کچھ دن بعد اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اب مسیحیت رومن امپائر کا "ملکی مذہب" قرار پائی۔ مگر سیاسی اقتدار ملتے ہی یہ مظلوم اور ستم رسیدہ مسیحیت ظالم و ستمگار بن گئی۔ رومن امپائر کی اگلی دو سو سال کی تاریخ مذہبی تشدد و تنگ نظری اور فرقہ وارانہ کش مکش کی مسلسل داستان ہے۔

قیصر تاؤذوسیوس (Theodosius) زمانہ ۳۷۹۔۳۹۵ء) کے تخت نشین ہونے پر رومی مملکت کے تمام باشندوں کو بالجبر عیسائی بنانے کی کارروائی پر سختی سے عمل کیا گیا۔ پادریوں نے بلا کسی استثناء کے تمام مندروں کو برباد کرنا شروع کیا۔ مگر سرافیس کے مندر کے معاملہ میں بلوہ ہو گیا۔ بڑی خونریزی کے بعد عیسائیوں نے اسے منہدم کر کے گرجا بنا لیا۔ اس مذہبی جنون کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ سرافیون کی لائبریری جو بطلیموس فیلاڈلفیوس کی لائبریری (کتب خانہ اسکندریہ) کے جل جانے پر، اس کی جگہ قائم ہوئی تھی ۳۹۱ء میں اس تعصب و تنگ نظری کا شکار ہو گئی۔ غرض کہ بقول ہٹی کے لفظوں میں:

"چوتھی صدی میں شہر اسکندریہ کے اندر کسی لائبریری کا وجود نہیں ملتا اور یہ فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کسی مذہبی یا ملکی حاکم نے کسی کتب خانہ کی نگہداشت کی زحمت گوارا کی ہو۔"

تاؤذوسیوس کے آخر عہد حکومت میں سائرل مصر کا اسقف اعظم بنا۔ اس نے مدارس فلسفہ کو بھی اپنے تعصب و تنگ نظری کا نشانہ بنایا کیونکہ اس کے خیال میں یہی جاہلیت و وثنیت کے مرکز تھے۔ اس کے اشارے سے فلاسفہ پر حملہ ہوا۔ اس تعصب و تنگ نظری کا تاریک ترین پہلو عقیل و فہیم ہائی پیشیہ (Hypatia) کا دردناک قتل تھا، جو اسکندریہ کی نوفلاطونی جماعت کی صدر تھی۔ تاریخ فکر انسانی کا یہ گھناؤنا سانحہ ۴۱۵ء میں پیش آیا۔

مسیحی تعصب نے اسی بہیمیت و درندگی پر بس نہیں کیا۔ اُن کی بربریت و ثقافت بیزاری نے منطق جیسے خشک مگر مفید فن کے بڑے حصہ کو بھی ممنوع التعلیم قرار دیا۔ چنانچہ ابن ابی اصیبعہ نے فارابی سے نقل کیا ہے:

"اسی طرح سے کام چلتا رہا، یہاں تک کہ مسیحیت کا زمانہ آیا تو فلسفہ کی تعلیم روم سے ختم کر دی گئی اور صرف اسکندریہ میں باقی رہ گئی۔ پھر نصرانی بادشاہ نے فلسفہ کی تعلیم پر غور کیا۔ پادری لوگ جمع ہوئے اور انھوں نے باہم اس بات پر مشورہ کیا کہ فلسفہ کی کتنی تعلیم باقی رکھی جائے اور کتنی بند کر دی جائے۔ اس پر یہ رائے ہوئی کہ منطق کی کتابوں میں سے اشکال وجود تک تعلیم دی جائے اور اس کے بعد کی تعلیم نہ دی جائے کیونکہ اس سے نصرانی مذہب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اور جتنے حصہ کی تعلیم باقی رکھی گئی تھی اس سے ان کے مذہب کی تائید میں مدد مل سکتی تھی۔ پس منطق کی اتنی ہی تعلیم کا رواج رہا اور باقی غیر مروج ہو گئی۔"[1]

---

(۱) طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ جلد ثانی ص ۱۳۵

فارابی کی اس روایت کی تصدیق ریناں اور اسٹینٹ نیڈر نے بھی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ارسطاطالیسی منطق کے سریانی تراجم ہمیشہ انالوطیقائے اولیٰ کی ساتویں فصل پر ختم ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہمت شکن حالات میں مدارس فلسفیہ کا باقی رہنا تقریباً ناممکن تھا، چنانچہ ماکس مایرہوف (Max Meirhoff) لکھتا ہے[1]:

"اس زمانہ میں کسی عام فلسفی مدرسہ کا وجود فرض کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ اس وقت سے مذہبی تعصب بڑھتا گیا اور اس نے دشمنی معلمین و تلامذہ کے لیے زندگی دشوار کر دی۔"

(۳) یونانی ثقافت کا خاتمہ

ان مشکلات و موانع کے باوجود بھی فلاسفہ نے کسی نہ کسی طرح علم و حکمت کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھا۔ مگر مسیحی تعصب اسے بھی برداشت نہ کر سکا اور آخر کار ۵۲۹ء میں قیصر جسٹینیان نے ایتھنز کے مدرسۂ فلسفہ کو جو افلاطون کی اکادیمیا اور ارسطو کے لائیسئم کا جانشین تھا سرکاری اعلان کے ذریعہ بند کر دیا۔ مدرسہ فلسفہ کی جائداد ضبط کر لی گئی اور فلاسفہ ملک بدر کر دیئے گئے جنھوں نے ایران جا کر نوشیرواں کے دربار میں پناہ لی۔

یونانی ثقافت کے اس خاتمہ کی وجہ بظاہر مسیحی تعصب و تنگ نظری تھی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یونانی عبقریت اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ ترقی پسندی کے بجائے رجعت پسندی اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ قدیم حکماء نے شرک و تکثیر سے بیزار ہو کر خدا پرستی اور توحید کی طرف قدم بڑھایا تھا لو فلاطونیت نے جو یونانی فلسفہ کا آخری دور ہے، قومی مذہب کی حمایت اور مسیحیت بیزاری کے نتیجہ میں پھر شرک و تکثیر کی طرف رجعت قہقری کی چنانچہ ولیم میل ان نوفلاطونی فلاسفہ کے بارے میں لکھتا ہے:

---

(۱) التراث الیونانی للدکتور عبدالرحمٰن البدوی۔ ص ۱۳

"یہ فلسفی متعدد دیوتاؤں کی پرستش کے آخری حامی تھے لیکن تکثیر نے ان کے ہاں فلسفیانہ توجیہہ اختیار کر لی تھی"[1]۔

نوفلاطونی مکتب فکر کا بانی فلاطینوس (Plotinus) ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر تھلی لکھتا ہے:

"فلاطینوس شرک و تکثیر کا انکار نہیں کرتا۔ دیوتا بھی الوہیت کے مظاہر ہیں۔ وہ عالم تحت القمر میں اچھے اور برے جنات اور بھوت پریتوں کا قائل ہے"[2]۔

اسی طرح ولیم نیسل اس کے بارے میں لکھتا ہے:

"وہ روایات اور دیو مالاؤں کے دیوتاؤں کی ایسی تاویل کرتا ہے کہ اس کا اطلاق اس کے نظام تعلیم پر ہو سکے۔ . . . . . بتوں کی پوجا، پیشین گوئی، دعا اور جادو وغیرہ کی عقلی توجیہہ وہ تمام اشیاء کے باہمی تاثری ربط سے کرتا تھا"[3]۔

پروفیسر تھلی فلاطینوس کے متبعین کے متعلق لکھتا ہے:

"اس کے بہت سے متبعین نے ان توہمات میں بے حد مبالغہ کیا، عوامی شرک و تکثیر کی حمایت کی، عیسائی مذہب پر حملے کیے اور جادو اور خرافات میں انہماک اختیار کیا"[4]۔

چنانچہ وہ آگے چل کر فرفوریوس (Porphyry) کے بارے میں لکھتا ہے:

"وہ تزکیۂ نفس کے لیے، ریاضت و مجاہدہ اور قومی مذہب پر اپنے استاد (فلاطینوس) سے بھی زیادہ زور دیتا ہے اور ہر طرح کے توہم پرستانہ معتقدات و اعمال کا قائل ہے جیسے بھوت

---

(۱) مختصر تاریخ فلسفہ یونان ص ۲۴۲

Thilly, *History of Philosophy*, p. 118.

(۳) مختصر تاریخ فلسفہ یونان ص ۲۴۳

پریتوں کا عقیدہ، پیشین گوئی، مورتی پوجا، جادو ٹونا وغیرہ ۔"(۱)

اسی (فرافوریوس) کے بارے میں ولیم نیسل لکھتا ہے:

"عیسائیوں کے خلاف پندرہ دفتروں میں وہ اپنے قومی مذہب کی حمایت کرتا ہے اور اس بارے میں جنات کی نسبت تمام مروجہ توہمات سے مدد لیتا ہے . . . . . . خونی قربانیاں وغیرہ ایسی چیزیں جن کو فی نفسہ بُرا سمجھتا ہے، اُن کو بھی عبادت عامہ میں خبیث روحوں کو شکست دینے کے لیے جائز قرار دیتا ہے"(۲)۔

اس توہم پرستی کا سب سے بڑا نوفلاطونی علمبردار ایاملیخس (Iamblicus) ہے۔ چنانچہ پروفیسر تھلی اس کے بارے میں لکھتا ہے:

"ایاملیخس جو نوفیثاغورثیت اور نوفلاطونیت دونوں کا منبع ہے، فلسفہ کو زیادہ سے زیادہ اپنے مشرکانہ مذہب کی تائید و اثبات کا ذریعہ بناتا ہے ۔ اس کے نظام معتقدات میں توہم پرستی فرفوریوس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہم کردار انجام دیتی ہے"(۳)۔

اسی طرح ولیم نیسل اس کے متعلق لکھتا ہے:

"(ایاملیخس کے یہاں) فوق الارضی دیوتاؤں کے علاوہ ارضی دیوتا بھی ہیں . . . . . . ان کے بعد جنات ملائکہ اور ابطال آتے ہیں ۔ قومی دیوتاؤں کو بھی وہ اس وہمی نظام میں جگہ دیتا ہے ۔ بتوں کی پوجا، جھاڑ پھونک، جادو، پیشین گوئی وغیرہ کی بھی وہ اسی قسم کی توجیہہ کرتا ہے"(۴)۔

ظاہر ہے کوئی تہذیب توہم پرستی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی ۔ اس لیے یونانی تہذیب

Thilly, *History of Philosophy*, p. 118.

(۲) مختصر تاریخ فلسفۂ یونان ص ۲۸۵ Thilly, *History of Philosophy*, p. 118.

Thilly, *History of Philosophy*, p. 118.

(۴) مختصر تاریخ فلسفۂ یونان ص ۲۸۶

ثقافت (جس کے بچانے کی یہ نوفلاطونی حکماء کوشش کر رہے تھے) کا خاتمہ فطری تھا، چنانچہ پروفیسر تھلی لکھتا ہے:

"لیکن اب اس فلسفہ میں کوئی جان نہیں رہ گئی تھی۔ قدیم شرک و تکثیر میں جان ڈالنے اور پرانی تہذیب کو بچانے کے سلسلے میں اس کی تمام کوششیں بے سود تھیں۔ یہ فلسفہ اپنی افادیت ختم کر چکا تھا۔"[1]

پروفیسر تھلی یونانی ثقافت کے خاتمہ کی اس تاریخی توجیہہ کے بعد لکھتا ہے:

"اب مستقبل اس نئے مذہب کا منتظر تھا جس کے خلاف اس فلسفہ نے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا تھا۔"[2]

مگر فاضل پروفیسر بربنائے خوش فہمی اس "نئے مذہب" کو عیسائی مذہب سمجھتا ہے، حالانکہ یہ مزعومہ "نیا مذہب" (مسیحیت) عہد نوفلاطونی کی مٹتی ہوئی یونانی ثقافت سے زیادہ "توہم پرستی" اور "عقلیت بیزاری" کا گہوارہ تھا۔ چنانچہ قرون وسطیٰ کے یورپ کی (جو اس نئے مذہب مسیحیت کا نقطۂ عروج ہے) علمی و ثقافتی خدمات کے بارے میں ایک فرانسیسی مورخ رقمطراز ہے:

"۵۲۹ء سے لے کر جب قیصر جسٹنیان نے یونانی مدارس کو بند کر دیا تھا، ۱۶۳۲ء تک جبکہ ڈیکارٹ کی مقالات بر مناہج شائع ہوئی یہ ذہنی کی ماتی انسانیت نے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا تھا یا یوں کہیے کہ علم و حکمت کے اہم مسائل کو تفکر و رویت کے حضور میں لانا ہی بند کر دیا تھا۔"[3]

اسی طرح قرونِ وسطیٰ کے علمائے مغرب کی مساعی فکریہ کی تنقیص کے متعلق ایم۔ ڈی ولف نے

Thilly, *History of Philosophy*, p. 119.

Thilly, *History of Philosophy*, p. 119.

Wulfe, *Scholasticism, Old and New*, p. 6.

Wulfe, *Scholasticism, Old and New*, p. 5.

دوسرے مورخین کے حسب ذیل خیالات نقل کیے ہیں:

"مثال کے طور پر مین کا خیال ہے کہ تیرھویں صدی کے فحول علماء (مغرب) کا زمانہ محض نالائقوں کا زمانہ ہے جو نفرت و حقارت کے سوا کسی اور بات کا مستحق نہیں ہے۔ اس تاریک عرصہ کی تہہ میں جو تین صدیاں گزری ہیں، انھوں نے انسان کے عقلی ورثہ میں ایک نئے تصور تک کا اضافہ نہیں کیا۔ دوسرے لوگوں کی رائے ہے کہ قرونِ وسطیٰ پر سے صاف پھاند جانا (نظر انداز کر دینا) ہی بہتر ہے یہ لوگ اس زمانہ کو انسانیت کے لیے موجب ننگ و عار سمجھتے ہیں۔"[1]

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مزعومہ "نئے مذہب" کے گہوارہ کے اندر علم و ثقافت کی قیادت پادری طبقہ کے ہاتھ میں تھی جن کے متعلق بیکن لکھتا ہے:

"ان کے علوم نے روبانحطاط ہو کر اس طرح بے کار اور غیر صالح مباحث کی شکل اختیار کر لی تھی جس طرح کوئی عضو سڑ کر متعفن ہو جاتا ہے۔"[2]

اس کے برخلاف اس "عہد تاریک" میں (جو قرون وسطیٰ کے لیے بالکل صحیح اور موزوں خطاب ہے) ربع مسکون کا ایک حصہ ایسا بھی تھا جو علم و حکمت کی روشنی سے جگ مگ کر رہا تھا۔ یہ "سریسنس" (Saracens) کا ملک تھا جو مشرق تاباں بنا ہوا تھا، "بنی اُمّی" کی امت کا ملک تھا جس کا ہر فرد بجائے خود افلاطون و ارسطاطالیس، اقلیدس و بطلیموس، بقراط و جالینوس کے اغلاط کی تصحیح کر رہا تھا۔ قرون وسطیٰ میں علم کی شمع صرف اسلام ہی کے کاشانہ میں روشن تھی۔ باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اگر باہر اجالا پہنچا تو یہیں سے پہنچا۔

لیکن یورپ کا پندار قومی اس حقیقتِ باہرہ کے اعتراف سے شرماتا ہے، کیونکہ

---

[1] Wulfe, *Scholasticism, Old and New*, p. 4.

[2] Draper, *History of Intellectual Development of Europe*, Vol. II, p. 42.

بقول گستاؤلی بان:

"بعض اشخاص کو اس خیال سے ہمیشہ شرم آتی ہے کہ وحشیانہ معاشرت سے عیسائی یورپ کے نکلنے کا باعث ایک کافر قوم (مسلمان) ہوئی۔ یہ خیال ان کے لیے اس قدر تکلیف دہ ہے کہ اس کا آسان ترین علاج اس حقیقت سے مکر جانا اور سرے سے صاف انکار کر دینا ہی ہے۔"

مگر تاریخی حقائق زیادہ عرصہ تک نہیں چھپائے جا سکتے۔ چنانچہ ڈریپر لکھتا ہے:

"مجھے اس منظم انداز حقیقت پوشی پر اظہار تاسف کرنا ہے جس طرح یورپ کے لٹریچر نے کوشش کی ہے کہ علم و حکمت کے باب میں ہم مسلمانوں کے جس قدر ممنون احسان ہیں، اسے نظروں سے اوجھل رکھا جائے۔ مگر حقیقتاً ان حقائق کو زیادہ عرصہ تک نہیں چھپایا جا سکتا۔ ..... مسلمانوں نے یورپ پر اپنے علمی احسانات کے دیرپا نشانات چھوڑے ہیں اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ دنیائے مسیحیت کو ان کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ انھوں نے (مسلمانوں نے) ان علمی آثار کو نہ مٹنے والے انداز میں آسمانوں پر ثبت کر دیا ہے جیسا کہ ہر وہ شخص جو کرۂ فلکی پر لکھے ہوئے ستاروں کے نام کو پڑھتا ہے اس کی تصدیق کرے گا۔"

ان تاریخی حقائق کے بعد یہ طے کرنا آسان ہے کہ یہ "نیا مذہب" مسیحیت نہیں تھا، بلکہ خدائے داور کا آخری پیغام "دین اسلام" تھا جو فاران کی مبارک چوٹیوں سے طلوع ہوا اور جس نے کچھ ہی عرصہ میں معمورۂ عالم کے ایک بڑے حصہ کو اپنے بریق و لمعان سے بقعۂ نور بنا دیا۔

(ب) فاران کی چوٹیوں سے آفتاب ہدایت کا طلوع

۵۲۹ء میں ایتھنز کا مدرسۂ فلسفہ بند ہوا اور اس کے چالیس سال بعد ۵۷۰ء میں اللہ کے

آخری رسولؐ کی ولادتِ باسعادت ہوگی جو صحیح معنوں میں

"وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین"(۱)

اور

"یا ایہا النبی انا ارسلناک شاہدا و مبشرا و نذیرا۔ و داعیا الی اللہ باذنہ و سراجاً منیرا"(۲)

کے مصداق ہیں۔ آخر بنی اسرائیل کو بھی تو فراعنہ کی غلامی سے نکل کر ارض موعود میں داخل ہونے سے پہلے چالیس سال سرگردانی کرنا پڑی تھی۔ انسانیت کو بھی عقل و خرد کے خود ساختہ اجارہ داروں کی غلامی سے خلاصی پاکر (جو یونانی علم و حکمت کی افادیت و رہنمائی سے مایوسی کا نتیجہ تھا) صاحب

"یعلمہم الکتاب والحکمۃ"

سے کسب فیض کرنے کے لیے چالیس سال انتظار کرنا تھا۔

بہرحال چھٹی صدی مسیحی کا دوسرا اہم بلکہ تاریخ عالم کا اہم ترین واقعہ ۵۷۰ء میں ظہور پذیر ہوا اور اس طرح دعائے خلیل

"ربنا و ابعث فیہم رسولا منہم یتلو علیہم آیاتک و یعلمہم الکتاب والحکمۃ و یزکیہم انک انت العزیز الحکیم"(۳)

---

(۱) انبیاء ۔ ۱۰۷ "اور ہم نے آپ کو نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے"

(۲) احزاب ۔ ۴۵، ۴۶ ۔ "اے غیب کی خبریں بتانے والے (نبی) بیشک ہم نے تمھیں بھیجا حاضر ناظر خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلاتا اور چمکا دینے والا آفتاب"

(۳) بقرہ ۔ ۱۲۹ "اے رب ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انھیں میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انھیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے اور انھیں خوب ستھرا فرمائے بیشک تو ہی غالب حکمت والا"

توریت (سفر تکوین باب ہفدہم درس ۲۰) میں بھی اللہ تعالیٰ کے حضرت ابراہیم کی اس دعا کو سننے اور مقرون باجابت فرمانے کا ذکر ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور نوید مسیحا

"یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقاً لما بین یدی من التورٰیۃ ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ احمدؐ"

پوری ہوئیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا بنی نوع انسان پر بڑا احسان ہے کہ آپؐ نے انھیں اپنے ہی بنی نوع کی فکری و معاشی غلامی سے آزادی دلائی، انھیں فلاح دارین کا راستہ دکھایا، اور اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت "علم و حکمت" کے دروازے ان پر کھول دیے۔ مگر اس کی تفصیل سے پیشتر اُس پس منظر کا بیان مستحسن ہوگا جس میں اسلام کی بعثت ہوئی۔

(۱) اسلام کا ثقافتی پس منظر

اسلام کا ثقافتی پس منظر بڑا ہی مظلم و تاریک ہے۔ عرب جہاں خورشید اسلام کی پہلی کرن چمکی، ثقافتی پسماندگی کی تاریک ترین منزل سے گزر رہا تھا اور واقعی "جاہلیت" کا مصداق تھا۔ غالباً فردوسی کا یہ طعنہ بے جا نہ تھا:

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

"And as for Ishmael, I have heard thee: Behold, I have blessed him, and will make him fruitful, and will multiply him exceedingly, twelve princes shall be beget, and I will make him a great nation" (Gen. 17 : 20).

(۱) صف ۶۔ "اے بنی اسرائیل میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں اپنے سے پہلی کتاب توریت کی تصدیق کرتا ہوا اور اس رسول کی بشارت سناتا ہوا جو میرے بعد تشریف لائیں گے۔ ان کا نام احمد ہے۔" اسی طرح انجیل یوحنا (باب ۱۴، درس ۷) میں ہے: "یہ امور میں نے تم سے کہے جبکہ تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن فارقلیط (احمد) جس کو باپ بھیجے گا میرے نام سے ہر بات تم کو سکھائے گا اور یاد دلائے گا تم کو تمام وہ باتیں جو کہ میں نے تم سے کہی ہیں۔"

زشیر شتر خوردن و سوسمار　　عرب را بجائے رسیدہ است کار

کہ ملک عجم را کنند آرزو　　تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

ہاں فردوسی کی غلطی یہ تھی کہ وہ اس عرب کو بھی جس کے رگ و پے میں اسلام نے ایک نئی روح پھونک دی تھی اور جو قادسیہ کی جنگ میں کمال بے جگری کے ساتھ لڑ رہا تھا اسی عرب جاہلیہ کی طرح سمجھتا تھا جو کسریٰ کے دربار میں دست بستہ کھڑا رہتا تھا اور جسے اپنے جہل پر عار نہیں بلکہ فخر تھا اور جس کا اعلان تھا کہ خبردار ہم سے کوئی جہالت نہ برتے ورنہ ہم جاہلوں سے بڑھ کر جاہل ہیں:

الا لایجھلن احد علینا　　فنجھل فوق جھل الجاھلینا[1]

عرب کی ثقافتی پسماندگی کا عالم یہ تھا کہ بعثت اسلام سے قبل نیم وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے نہ خوب و ناخوب کا کوئی معیار تھا، نہ اجتماعی تنظیم کے لیے کوئی محکم بنیاد و ضابطۂ اخلاق۔ چنانچہ جب پہلی مرتبہ مسلمان کفار مکہ کی ایذا رسانی سے تنگ آکر حبش چلے گئے اور نجاشی نے ان سے اس تبدیلی مذہب کی وجہ دریافت کی تو حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے فرمایا:

"ایھا الملک کنا اہل الجاھلیۃ نعبد الاصنام و ناکل المیتۃ و ناتی الفواحش و نقطع الارحام و نسی الجوار و یاکل القوی منا الضعیف حتی بعث اللّٰہ الینا رسولا منا نعرف نسبہ و صدقہ و امانتہ۔"[2]

"اے بادشاہ ہم اہل جاہلیت تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، فواحش کا ارتکاب کرتے تھے، رشتہ داری کے تقاضوں کی پروا نہیں کرتے تھے، مصیبت زدہ پڑوسیوں کو فراموش کر دیتے تھے، ہم میں جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو کھا جاتا، ہماری یہ حالت تھی کہ اللّٰہ تعالیٰ نے ہمیں میں سے ہماری طرف ایک پیغمبر کو مبعوث کیا، جس کے خاندان، جس کی صدق بیانی اور جس کی امانت اور دیانتداری کو ہم اچھی طرح جانتے تھے۔"

---

(۱) سبع معلقات۔ معلقہ عمرو بن کلثوم　　(۲) تاریخ کامل لابن الاثیر۔ ج ثانی

ظاہر ہے ایسی نیم متمدن قوم سے علم و حکمت یا تعلیم، تعلم کی کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ بعثتِ اسلام کے وقت پورے ملک میں سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے عربوں کی لغت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ کتاب سے واقف تھے نہ کتابت سے ہاں اہل عرب کتاب کے بجائے "کتیبہ" کو خوب جانتے تھے جس کے معنی لشکر ہیں۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ اسی وحشیانہ لفظ سے ان کے یہاں وہ لفظ بنا جو تہذیب و ثقافت کی کلید ہے یعنی "کتاب"! چنانچہ تفسیر بیضاوی میں "کتاب" کے اشتقاق کے بارے میں لکھا ہے۔

"واصل الکتب الجمع ومنہ الکتیبۃ"[1] ("کتب" کی اصل جمع ہے اور اسی لیے لشکر کو کتیبہ کہتے ہیں (کیونکہ وہ ملا ہوا ہوتا ہے)

لیکن بعثتِ اسلام نے پورے عرب کی (بلکہ معمورۂ عالم کی) کایا پلٹ کر دی۔ آفتابِ رسالت کا طلوع ہونا تھا کہ کچھ ہی دن میں عرب اور اس کے طفیل میں عالم تمام مطلع انوار ہو گیا یہ قلب ماہیت منطقی نتیجہ تھا اسلام کی بنیادی تعلیم کا۔

(۲) اسلام کی بنیادی تعلیم

اسلام کی بنیادی تعلیم "توحید ربوبیت" ہے۔ یہی اصل پیغام تھا جسے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے:

"یا ایہا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون"[2]

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

"والٰھکم الٰہ واحد لا الٰہ الا ہو الرحمٰن الرحیم"[3]

---

(۱) تفسیر بیضاوی مطبوعہ احمدی پریس ۱۲۸۶ھ، ص ۱۲ (۲) بقرہ - ۲۱ - "اے لوگو! اپنے رب کو پوجو جس نے تمھیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمھیں پرہیزگاری ملے۔" (۳) بقرہ - ۱۶۳ - "اور تمھارا معبود ایک (اکیلا) معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں مگر وہی بڑی رحمت والا مہربان۔"

مگر قرآن اس "توحید ربوبیت" ایک تکوینی حقیقت بنا کر ہی نہیں چھوڑ دیتا۔ وہ اپنے متبعین کو ایجابی طور پر مامور کرتا ہے کہ خود کو غیر اللہ کی عبادت سے بچائیں:

"وقضیٰ ربک الا تعبدوا الا ایاہ[1]"

وہ کسی طرح اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ وہ غیر اللہ کے سامنے سر جھکائیں۔ یہ ایسا جرم ہے جو ناقابلِ عفو ہے۔

"ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء ومن یشرک باللہ فقد افتریٰ اثما عظیما[2]"

یہ توحید ربوبیت اسلام کی تعلیم کا سنگِ بنیاد اور اس کی ثقافت اور کلچر کا اصل الاصول ہے۔ اس کے تین منطقی نتیجے تھے۔

اولاً: احساسِ خودداری وعزتِ نفس کیونکہ کلمۂ توحید کی اصل اتنی ہی ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

یعنی اللہ رب العزۃ کے سوا انسان کا کوئی آقا نہیں، سب اس کے محکوم ہیں۔ کائنات کی سب سے افضل واشرف مخلوق انسان ہی ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"ولقد کرمنا بنی آدم[3]"

دنیا میں اشرف المخلوقات ہونے کا یہ احساس اس کی اخلاقی بلندی اور خودی و خودداری کا ضامن ہے۔ دنیا کی ہر چیز اللہ تعالیٰ نے اسی کے واسطے پیدا کی ہے۔

---

(۱) اسراء ۲۳: "اور تمھارے رب نے حکم فرمایا کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو" (۲) نساء ۴۸: "بیشک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کا کوئی شریک ٹھہرایا جائے اور اس سے نیچے جو کچھ ہے، جسے چاہے معاف کر دیتا ہے اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے اس نے بڑے گناہ کا طوفان باندھا۔"

(۳) اسراء ۷۰: "اور بیشک ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی۔"

"ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعا"[1]۔

اور وہ صرف خلاق کائنات کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے :

"وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون"[2]۔

ثانیاً : حریت نفس و آزادی رائے :۔ جب خلاق کائنات کے سوا انسان کا کوئی آقا نہیں تو ایک انسان بھی دوسرے انسان کا محکوم و پابند نہیں ۔ امم قدیمہ کی تاریخ اٹھاکر دیکھیے تو ایک طرف اسکندر و دارا کی جباریت و استبداد ہے اور دوسری جانب احبار و رہبان کی جھوٹی خدائی۔ اسلام دونوں کی خدائی کا منکر ہے ۔ جس طرح وہ طواغیت روزگار کی عبودیت کے خلاف ہے ، اسی طرح وہ مذہبی پروہتوں کو بھی " اربابا من دون اللہ " کے لقب سے تعبیر کرتا ہے ۔ اور ان کے اتباع کو شرک بتاتا ہے جو اسلامی تعلیمات کی رو سے ناقابل معافی جرم ہے ۔ چنانچہ قرآن پچھلی مذہبی برادریوں کے بارے میں کہتا ہے :

"واتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ"[3]۔

کیونکہ علم و حکمت کے ان خود ساختہ اجارہ داروں نے خدا کے بندوں کو اوہام باطلہ کا شکار بنا رکھا تھا جن کے بار گراں سے اُن کی مضطرب انسانیت دبی جارہی تھی مگر نکل نہ سکتی تھی ، جس طرح وہ سوسائٹی کے جھوٹے ٹھیکہ داروں کی معاشی دستبرد سے زبوں حال تھی مگر راہ مفر نہ پاتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانیت پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اسے اپنے ہی بنی نوع کی ذہنی و معاشی غلامی سے آزاد کیا ۔ قرآن کہتا ہے :

"ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم"[4]۔

---

(۱) بقرہ ۔ ۲۹ ۔ " وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے " (۲) ذاریات ۔ ۵۶ ۔ " میں نے جن اور آدمی اسی لیے بنائے کہ میری بندگی کریں " (۳) توبہ ۔ ۳۱ ۔ " انھوں نے اپنے پادریوں اور جوگیوں کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا " (۴) اعراف ۔ ۱۵۷ : " اور ان پر سے وہ بوجھ اور گلے کے پھندے جو اُن پر پڑے، اتارتے اور دور کرتے ہیں "

اور اس طرح امت مسلمہ میں کورانہ تقلید کے بجائے جو امم ماضیہ میں عام تھی، حریت نفس، آزادی رائے اور ذوق تحقیق کا جذبہ پیدا ہوا جو سائنس اور حکمت کی ترقی کا سب سے بڑا محرک ہے۔

(۳) تسخیر کائنات کی تشجیع

کائنات میں افضل و اشرف ہونے کے احساس کا منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ پیروانِ اسلام کائنات کے سامنے لرزتے اور گڑگڑاتے بھکاری کی حیثیت سے نہیں، بلکہ شکاری کی حیثیت سے جائیں اور اس کی ظاہر و پوشیدہ قوتوں کو قابو میں کر کے اپنے مقصد کے مطابق استعمال کریں۔ اسی کا نام تسخیر کائنات ہے، جس کے لیے قرآن بار بار ہمت افزائی کرتا ہے۔

"الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السمٰوات وما فی الارض واسبغ علیکم نعمہ ظاہرۃ و باطنۃ"[1]

دوسری جگہ ارشادِ باری ہے:

"اللہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک فیہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون۔ وسخر لکم ما فی السمٰوات وما فی الارض جمیعاً منہ ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون"[2]

لیکن کائنات کی زندہ اور بے جان قوتوں کی تسخیر براہِ راست کشتی لڑ کر نہیں کی جا سکتی: ہاتھی کو اٹھا کر نہیں پٹکا جا سکتا، مگر آنکس کے ذریعہ قابو میں لایا جاتا ہے۔ دریا کا زور ہاتھوں سے پانی کو جھکولے دے کر نہیں توڑا جا سکتا، مگر ٹربائن کے ذریعہ اس کی توانائی کو بجلی کی شکل میں ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ پہاڑ کو گھونسوں سے نہیں توڑا جا سکتا، مگر ڈائنامیٹ کے ذریعہ اس میں شگاف ڈال

---

(۱) لقمان۔ ۲۰: "کیا تم نے نہ دیکھا کہ اللہ نے تمھارے لیے کام میں لگائے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور تمھیں بھرپور دیں اپنی نعمتیں ظاہر اور چھپی"۔ (۲) جاثیہ۔ ۱۲-۱۳: "اللہ ہے جس نے تمھارے بس میں دریا کر دیا کہ اس میں اس کے حکم سے کشتیاں چلیں اور اس لیے کہ اس کا فضل تلاش کرو اور اس لیے کہ احسان مانو اور تمھارے کام میں لگائے جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں اپنے حکم سے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں سوچنے والوں کے لیے"۔

کر سرنگیں کھودی جاتی ہیں۔ سمندر کی لہروں کے سامنے نہیں ٹھہرا جا سکتا، مگر کروزر اور سب میرین کے ذریعہ طوفانی سمندروں میں بھی بے خطر سفر کیا جاتا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ صرف "تسخیر ارض وسمٰوٰت اور کائنات کی پوشیدہ قوتوں کی واقفیت۔ اسی کا نام "علم طبیعی" اور "نیچرل سائنس" ہے۔ اسی لیے اسلام دینی علوم کے ساتھ جو آنے والی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہیں، طبیعیاتی علوم کے حصول کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے:

"اطلبوا العلم ولو کان بالصین"

ظاہر ہے چین اور جاپان میں حاصل ہونے والا علم اللہ اور اس کے رسولؐ کی معرفت کا علم تو نہیں ہوگا۔ اس کے لیے تو "اللہ کی کتاب" اور "اس کے رسولؐ کی سنّت" کافی تھی۔ یہ صرف دنیوی علم ہی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تھا: حکمت مردمومن کی متاع گم شدہ ہے، جہاں ملے لے لے"

"کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن اینما وجدہا فہو احق بہا"

(۴) اسلام اور علوم طبیعیہ کی ہمت افزائی

اسلام اپنے متبعین کو ایجابی طور پر مامور کرتا ہے کہ وہ مظاہر کائنات کا مشاہدہ کریں، کیونکہ ان میں سوچنے سمجھنے والوں کی رہنمائی کے لیے نشانیاں ہیں

"قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت والارض وما تغنی الآیات والنذر عن قوم لا یؤمنون"[۲]

یہی نہیں بلکہ وہ اس فریضہ سے پہلوتہی کرنے والوں پر زجر و توبیخ کرتا ہے:

"اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض وما خلق اللہ من شیٔ وان عسٰی ان یکون قد

---

(۱) علم حاصل کرو اگرچہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو۔

(۲) یونس ۱۰۱۔ "تم نصیحت فرماؤ۔ دیکھو (اس کی مشیت سے) آسمانوں اور زمین میں کیا ہے (جو اللہ کی توحید پر دلالت کرتا ہے) اور آئتیں اور رسول انھیں کچھ نہیں دیتے جن کے نصیب میں ایمان نہیں۔"

اقترب اجلھم فبای حدیث بعدہ یومنون[1] ۔"

اسلامی آئیڈیالوجی میں تکمیل ایمان " ایمان بالآخرۃ " پر موقوف ہے اور اس کے ایقان کے لیے تخلیق کائنات کا مطالعہ اور اس کے لیے سیر و سیاحت ضروری ہے :

" قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدء الخلق ثم اللہ ینشئ النشأۃ الآخرہ ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر[2] ۔"

اور اس فریضہ کی بجا آوری میں کوتاہی کرنے والوں سے وہ باز پرس کرتا ہے :

" اولم یروا کیف یبدئ اللہ الخلق ثم یعیدہ ان ذلک علی اللہ یسیر[3] ۔"

اتقا اور انابت الی اللہ جو ایمان کا اعلیٰ و ارفع مرتبہ ہے ، اس کی تکمیل مظاہر کائنات اور ان کے تبدل و اختلاف کے مطالعہ کے ساتھ مشروط ہے :

" ان فی اختلاف اللیل والنہار وما خلق اللہ فی السمٰوٰت والارض لآیات لقوم یتقون[4] ۔"

یہ تخلیق ارض و سماوات کا مطالعہ اور مظاہر کائنات کے دوری اختلافات کا مشاہدہ ان اولی الالباب کا شعار ہے جنھوں نے " ذکر اللہ " کو اپنا وظیفہ حیات بنا لیا ہے :

" ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب الذین

---

(۱) اعراف ۱۸۵ ۔ " کیا انھوں نے نگاہ نہ کی ملکوت ارض و سماوات میں اور جو چیز اللہ نے بنائی اور یہ کہ شاید ان کا وعدہ نزدیک آ گیا ہو تو اس کے بعد اور کونسی بات پر ایمان لائیں گے ۔ (۲) عنکبوت ۲۰ ۔ " تم فرماؤ زمین میں سفر کر کے دیکھو اللہ کیونکر پہلے بناتا ہے ، پھر اللہ دوسری اٹھان اٹھاتا ہے ۔ بے شک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے ۔ " (۳) عنکبوت ۱۹ ۔ " اور کیا انھوں نے نہ دیکھا ، اللہ کیونکر خلق کی ابتدا فرماتا ہے اور تدریجاً ان کی خلقت کو مکمل کرتا ہے ، پھر اسے دوبارہ بنائے گا ۔ بے شک یہ اللہ کو آسان ہے ۔ "

(۴) یونس ۶ ۔ " بے شک رات اور دن کا بدلتے آنا اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ، ان میں نشانیاں ہیں متقیوں کے لیے ۔ "

یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربنا ما خلقت ہذا باطلا فقنا عذاب النار[1]"

"تاریخ کا یہ ناقابلِ تردید واقعہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جو اصولاً ایک "مذہبی کتاب" ہے، اُن تمام علوم کی تشجیع وہمت افزائی کی ہے جو آج یا آیندہ "طبیعیاتی علوم" کے تحت میں محسوب ہونگے، مثلاً قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ فلکیاتی مشاہدہ ملتِ اسلامیہ کا مقدس ترین ورثہ ہے۔ اسی نے ہمارے جدامجد سیدنا ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی چشمِ جہاں بین کو نورِ توحید سے روشن کیا۔ بقول علامہ اقبال:

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

قرآن کہتا ہے:

"فلما جن علیہ اللیل رای کوکبا قال ہذا ربی فلما افل قال لا احب الآفلین۔ فلما رای القمر بازغاً قال ہذا ربی فلما افل قال لئن لم یہدنی ربی لاکونن من القوم الضالین۔ فلما رای الشمس بازغۃً قال ہذا ربی ہذا اکبر فلما افلت قال یاقوم انی بری مما تشرکون۔ انی وجہت وجہی للذی فطرت السمٰوٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین[2]"۔

---

(۱) آلِ عمران، ۱۹۰-۱۹۱۔ "بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کی باہم بدلیوں میں نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لیے جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پہ لیٹے اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں (یہ کہتے ہوئے کہ) اے رب ہمارے تو نے یہ بیکار نہ بنایا۔ پاکی ہے تجھے تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔" (۲) انعام۔ ۷۶-۷۸۔ "پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھاگئی تو انھوں نے (حضرت ابراہیمؑ نے) ایک ستارا دیکھا۔ تب آپ نے فرمایا کہ (تمہارے زعم کے مطابق) یہ میرا رب ہے۔ سو جب وہ غروب ہوگیا تو آپ نے فرمایا کہ غروب ہوجانے والے سے میں محبت نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا (تمہارے زعم کے مطابق) یہ میرا رب ہے۔ سو جب وہ غروب ہوگیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو میرا رب (حقیقی) (باقی اگلے صفحہ پر)

چنانچہ جب آیہ کریمہ

"ان فی خلق السموٰت والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب۔"

کا نزول ہوا تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ویل لمن لاکہا بین لحیتیہ ولم یتفکر فیہا۔"[1]

اسی طرح قرآن دیگر طبیعیاتی علوم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"ان فی السموٰت والارض لآیات للمومنین وفی خلقکم وما یبث من دابۃ آیات لقوم یوقنون۔ واختلاف اللیل والنہار وما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیا بہ الارض بعد موتہا وتصریف الریاح آیات لقوم یعقلون۔"[2]

قرآن کہتا ہے کہ مظاہر کائنات میں معرفت باری تعالیٰ کی نشانیوں کے علاوہ غور و فکر کرنے والوں کے لیے اور بھی کچھ ہے کیونکہ کائنات وما فیہا ان کی میراث ہے، اس لیے انھیں اس کی تسخیر کا طریقہ جاننا چاہیے:

"والارض بعد ذلک دحاہا۔ واخرج ماءہا ومرعاہا۔ والجبال ارساہا۔ متاعاً لکم ولانعامکم۔"[3]

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ہدایت نہ کرتا رہے تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔ پھر جب آفتاب کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ (تمہارے زعم کے مطابق) یہ میرا رب ہے، یہ تو سب میں بڑا ہے، سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا: اے قوم بیشک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ میں اپنا رخ اس (ذات پاک) کی طرف (کرکے تم سے ظاہر) کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں"۔

(۱) تباہی ہے اس کے لیے جس نے اس آیت کی اپنے جبڑوں کے درمیان تلاوت کی مگر اس کے معانی میں غور و فکر نہ کیا۔" (۲) جاثیہ ۳۔۵۔ "بے شک آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں ایمان والوں کے لیے اور تمہاری پیدائش میں اور جو جانور وہ پھیلاتا ہے، ان میں نشانیاں ہیں یقین والوں کے لیے اور رات دن کی تبدیلیوں میں اور اس میں کہ اللہ نے آسمان سے روزی کا سبب (مینہ) اتارا تو اس سے زمین کو مرے پیچھے زندہ کیا اور ہواؤں کی گردش میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لیے۔" (۳) نازعات ۳۰۔۳۳۔ "اور اس کے بعد زمین پھیلائی، اس میں سے (باقی اگلے صفحہ پر)

لہذا انسان کو تمتع بالکائنات کے ساتھ اس عمل الٰہی پر بھی نظر رکھنا چاہیے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"فلینظر الانسان الی طعامہ۔ انا صببنا الماء صباً۔ ثم شققنا الارض شقاً۔ فانبتنا فیھا حباً۔ وعنباً وقضباً۔ وزیتوناً ونخلاً۔ وحدائق غلباً۔ فاکھۃً وابّاً۔ متاعاً لکم ولانعامکم۔"

وہ مظاہر جو کہ ساتھ ساتھ کائنات حیوانی کے مطالعہ پر بھی برانگیختہ کرتا ہے کیونکہ اسلامی تعلیم کی تکمیل کا صحیح راستہ یہی ہے اور اسی کی مدد سے ایمان تک رسائی ہوتی ہے:

"افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔ والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت۔ فذکر انما انت مذکر۔"[۲]

اسی طرح وہ تاریخ طبیعی اور حیوانیات کے مطالعہ کی تشجیع کرتا ہے:

"واللہ خلق کل دابۃ من ماء فمنھم من یمشی علیٰ اربع یخلق اللہ ما یشاء ان اللہ علیٰ کل شیٔ قدیر۔"[۳]

ایک اور مقام پر وہ حیوانات کے تشریحی اور فعلیاتی (Physiological) مطالعہ کی ہمت افزائی کرتا ہے:

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) اس کا پانی اور چارہ نکالا، اور پہاڑوں کو جمایا، تمہارے اور تمہارے چارپایوں کے فائدے کے لیے۔" (۱) عبس۔ ۲۴۔ ۳۲۔ "تو آدمی کو چاہیے اپنے کھانے کو دیکھے کہ ہم نے اچھی طرح پانی ڈالا، پھر زمین کو خوب چیرا، تو اس میں اگایا اناج اور انگور اور چارہ اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغیچے اور میوے اور دوب، تمہارے فائدے کو اور تمہارے چوپایوں کے فائدے کو۔" (۲) خاشیہ۔ ۱۷۔ ۲۱۔ "تو کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے کیسا بنایا گیا، اور پہاڑوں کو کہ کیسے قائم کیے گئے اور زمین کو کہ کیسی بچھائی گئی تو تم نصیحت سناؤ، تم تو یہی نصیحت سنانے والے ہو۔"

(۳) نور۔ ۴۵۔ "اور اللہ نے زمین پر ہر چلنے والا پانی سے بنایا تو ان میں سے کوئی اپنے پیٹ پر چلتا ہے اور ان میں سے کوئی دو پاؤں پر چلتا ہے، اور ان میں سے کوئی چار پاؤں پر چلتا ہے۔ اللہ بناتا ہے جو چاہے، بیشک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

"وان لکم فی الانعام لعبرۃ نسقیکم مما فی بطونہ من بین فرث ودم لبناً خالصاً سائغاً للشاربین"

دوسری جگہ اڑنے والی مخلوقات کے تحقیقی مطالعہ پر برانگیختہ کرتا ہے:

"اولم یروا الی الطیر فوقھم صافات ویقبضن مایمسکھن الا الرحمٰن انہ بکل شئی بصیر"

اس کے بعد یہ دیکھنا آسان ہے کہ یونانی حکمت کے خاتمہ کے بعد دنیا کی آئندہ ثقافتی قیادت کا حقدار مسیحیت نہیں بلکہ اسلام تھا۔

انڈونیشیا

(مصنفہ شاہد حسین رزاقی)

جمہوریہ انڈونیشیا کا مکمل خاکہ جس میں تاریخی تسلسل کے ساتھ اس ملک کے حالات اور اہم واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔ اور دینی، سیاسی، معاشی و ثقافتی تحریکوں، قومی اتحاد و استحکام کی جدوجہد، نئے دور کے مسائل اور تعمیر و ترقی کے امکانات جیسے تمام اہم پہلوؤں پر اس انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے کہ انڈونیشیا کے ماضی و حال اور مستقبل کا نہایت واضح نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

قیمت قسم اول ۹ روپے

قیمت قسم دوم ۷ روپے

ملنے کا پتہ

سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور